Scanned with CamScanner

اُردو کی تہذیبی معنویت

اُردو کی تہذیبی معنویت

سیّد علی محمد خسرو

کے۔جی۔سیّدین میموریل ٹرسٹ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار اگست ۸۷ء　　تعداد 1000　　قیمت =/6

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

Scanned with CamScanner

دیباچہ

خواجہ غلام السیّدین، ہمارے ایک عظیم دانشور، معلّم اور ادیب تھے۔ ان کی یاد میں خاص لیکچروں کا ایک سلسلہ سیّدین میموریل ٹرسٹ نے شروع کیا ہے۔ شروع میں جو لیکچر ہوئے، وہ تعلیم کے ماہرین کے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں دو لیکچر پروفیسر کلیم الدین احمد نے ادبی تنقید پر دیے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں ممتاز نقّاد پروفیسر آل احمد سرور کو زحمت دی گئی۔

خواجہ غلام السیّدین ان لوگوں میں سے تھے جنھیں مجموعۂ خوبی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی ذات گوناگوں کمالات اور صفات کا مرکز تھی۔ تعلیم کے میدان میں، سماجی خدمت کے میدان میں اور ادب کی دنیا میں ان کی خدمات نہایت وسیع ہیں اور آنے والوں کے لیے مثال کا کام دیتی رہیں گی۔ ان کی نثر کا ایوان انسانی اقدار کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ انھوں نے سچی انسانیت اور آدمیت پر ہمیشہ زور دیا اور سیرت کی تعمیر کے لیے جن ذرائع کو بالعموم نظرانداز کردیا جاتا ہے، سیّدین صاحب بار بار ان کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ ان کی پوری زندگی ایک ایسے خاموش مجاہد کی زندگی ہے جو انسانی اقدار کی روشنی کو عام کرنے کے لیے انتہائی صبر اور ایثار سے کام کرتا رہا ہو، رواداری، خدمتِ خلق، نیکی، شرافت، لگن، محنت، ایمان داری، سچائی، محبّت، اخلاص ان سب قدروں کی روشنی ان کی تحریروں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن ایک چیز جس سے ان تمام اقدار کی شیرازہ بندی ہوتی ہے وہ ہے ذہن و فکر کی آزادی اور ضمیر کی آواز۔ فکر کے چراغ روشن رکھنا بے حد ضروری ہے۔ فکر کی جوت جلتی رہے تو ادب اور علوم میں بھی مدد ملتی ہے اور قومی و سماجی مسائل میں بھی دانشور صحیح معنوں میں رہنمائی کا حق ادا کرسکتے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ پروفیسر علی محمد خسرو نے جس موضوع کا انتخاب فرمایا ہے وہ سب کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا اور دعوتِ فکر بھی دے گا۔ خسرو صاحب ماہرِ معاشیات ہیں اور اس میدان میں ان کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اُردو زبان اور ادب سے آپ کو گہرا شغف ہے، آپ نے اپنے اس بصیرت افروز مقالے میں اُردو کی تہذیبی معنویت پر گہرائی سے روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ اس کے موجودہ مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا رشتہ بڑی خوبی سے معاشیاتی وجوہ سے ملایا ہے اور کہا ہے کہ اُردو میں رسد کی کمی نہیں طلب کی کمی ہے۔ اور اس پر زور دیا ہے کہ اُردو کو جب تک روزگار سے نہیں جوڑا جائے گا اُردو کے مستقبل کا سوال حل نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر خسرو کا یہ لیکچر سیّدین میموریل لیکچرز کی ساتویں کڑی ہے۔ اس سے پہلے کے چھے لیکچرز ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔

ٹرسٹ نے سیّدین صاحب کی سوانح "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں"، "افکارِ سیّدین" (مجموعۂ مضامین) "سخنِ دلنواز" (خطوط) اور "دنیا میرا گاؤں" (سفرنامے) شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی مشہور تصنیف Iqbal's Educational Philosphy بھی شائع ہو رہی ہے۔ ان کے انگریزی مضامین کا مجموعہ، ریڈیائی تقاریر اور ان کے نام مشاہیر کے خطوط پر بھی کام ہو رہا ہے۔

ٹرسٹ کے روحِ رواں جناب کرنل بشیر حسین زیدی ہیں۔ ہمارے سب کام ان کی اور بیگم صالحہ عابد حسین کی توجہ دلچسپی اور رہنمائی کے مرہونِ منت ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸ر اگست ۱۹۸۶ء

گوپی چند نارنگ
(سکریٹری)

خواجہ غلام السیّدین میموریل لکچر

اُردو کی ثقافتی معنویت

جناب صدر، کرنل زیدی، نارنگ صاحب، خواتین وحضرات!

خواجہ غلام السیّدین مرحوم کی یاد میں آج کا لکچر دینے کی جو ذمّے داری مجھے دی گئی ہے وہ میرے لیے باعثِ صد فخر ہے۔ بانیانِ جلسہ کا بے حد مشکور ہوں کہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھا اور آپ سب حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ یہاں تشریف لاکر میرا دل بڑھایا اور عزّت بخشی۔

ڈاکٹر خواجہ غلام السیّدین نے ملک کے تعلیمی اور ثقافتی نقشے پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے اور زمانۂ طالب علمی ہی سے اور جب سے وہ علی گڑھ مُسلم یونی ورسٹی کی اسٹوڈنٹ یونین کے صَدر چُنے گئے تھے تب ہی سے ان کی آنے والی کامیابیوں اور خدمتِ ملک و قوم کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ پچاس سال تک وہ ملک کے تعلیمی اور علمی آسمان پر ایک درخشاں ستارے کی طرح چمکتے رہے۔ مسلم یونی ورسٹی کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل رہے۔ جمّوں کشمیر، رام پور اور بمبئی کی حکومت کے تعلیمی صلاح کار بنے۔ حکومتِ ہند کے ایجوکیشن سکریٹری کی حیثیت سے نہایت اہم خدمات انجام دیں، انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کے ڈائرکٹر رہے۔ امریکہ اور آسٹریلیا

رہے، ہندستان، عراق اور سوڈان میں تعلیمی کمیشنوں میں کام کیا، Visiting Professor کئی عمدہ کتابیں لکھیں اور دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے۔ آج ہم اس لکچر کے ذریعے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور آیندہ بھی کرتے رہیں گے۔

جن نامساعد اور غیر معمولی رنج وغم اور ٹریجڈی کے حالات میں یہ لکچر منعقد ہوا ہے اس کا ہم سب کے دلوں پر اثر ہے۔ کل ہی ان کے نوجوان اور ہونہار نواسے نے اس دُنیا سے کوچ کیا

یہ خواجہ غلام السیّدین مرحوم کے قریبی متعلقین کی بڑائی ہے کہ ان حالات میں بھی انھوں نے اس لکچر کی اجازت دے دی کہ علمی کام میں کوتاہی بہرحال نہیں ہونی چاہیے اور یہ کہ اگر خواجہ صاحب ہمارے درمیان ہوتے بھی تو ایسا ہی کرتے۔

سید علی محمد خسرو

اُردو کی تہذیبی معنویت

چند برس پہلے میں نے ہندستان کی لسانی آبادی کا ایک ریاست واری تختہ اور نقشا تیار کروایا تھا۔ چونکہ ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے لسانی اعداد و شمار ابھی تک شائع نہیں کیے گئے ہیں، اس لیے ۱۹۶۱ء کے آنکڑوں سے کام لیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں ہندستان میں ۱۶ ریاستیں تھیں اور اگر دلی کو بھی ایک ریاست مان لیا جائے اور دوسری چھوٹی یونین ٹریٹریز کو چھوڑ دیا جائے تو کُل ۱۷ ریاستیں تھیں۔

دستورِ ہند میں جن ۱۴ زبانوں کا ذکر ہے ان میں انگریزی کو چھوڑ کر باقی ۱۳ زبانوں کے بولنے والوں کی گنتی ۴۳ کروڑ ۵۶ لاکھ تھی اور اُردو (بحیثیت مادری یا اولین زبان) کے بولنے والے ۲ کروڑ ۵۲ لاکھ یعنی ۶ فی صد تھے۔ ۱۳ زبانوں میں اُردو کا چھٹا درجہ تھا یعنی ہندی، تلگو، مراٹھی، بنگالی اور تامل کے بعد، مگر گجراتی، کنڑ، اڑیا، ملایالم، پنجابی، آسامی اور کشمیری سے پہلے۔

یہ نقشا اور تختہ چشمِ ظاہر کے پردے کو ہٹاتا ہے اور بینائی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس نقشے اور تختے میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ۱۷ ریاستوں میں سے ہر ریاست میں چار مقبول ترین زبانیں کون سی ہیں۔ نقشے میں ہر ریاست میں چار دائرے کھینچے گئے ہیں اور بیچ کے دائرے میں سب سے زیادہ مقبول زبان اور اس سے باہر کے دائروں میں دوسری، تیسری اور چوتھی مقبول ترین زبان کے بولنے والوں کے آنکڑے مہیا کیے گئے ہیں۔

تختے اور نقشے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۷ ریاستوں میں سے ہندی ۱۶

ریاستوں میں چار سب سے زیادہ بولی جانے والی بھاشاؤں میں سے ہے۔ اس کے برخلاف پنجابی ۲ ریاستوں میں، اڑیا ۵ ریاستوں میں، مراٹھی چار ریاستوں میں، اور بنگالی، تلگو، تامل اور کنڑ صرف ۳ ریاستوں میں مقبول ترین ۴ زبانوں میں سے ہیں۔ اب رہی اُردو، سو اُردو ۱۷ ریاستوں میں سے ۱۵ ریاستوں میں ۴ مقبول ترین زبانوں میں اپنا مقام رکھتی ہے۔

اُردو کسی بھی ریاست میں آبادی کی اکثریت کی زبان نہیں ہے۔ جیسے تامل ناڈ میں تامل یا مہاراشٹر میں مراٹھی ہے۔ اس لیے نقشے میں بیچ کے دائرے میں کہیں اُردو کا ذکر نہیں ہے مگر ۱۷ ریاستوں میں سے ۵ ریاستوں میں دوسری مقبول ترین زبان اُردو ہی ہے۔ اسی طرح ۷ ریاستوں میں تیسری اور ۳ ریاستوں میں چوتھی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اُردو ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقشے میں دوسرے، تیسرے اور چوتھے دائروں میں ۱۷ میں سے ۱۵ ریاستوں میں اُردو کا مقام ہے اور یہ شرف سوائے ہندی کے کسی اور زبان کو حاصل نہیں۔

ان حقیقتوں سے ظاہر ہے کہ اُردو بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہر جگہ موجود ہیں اور اُردو ہندستان کے تقریباً ہر علاقے کی اہم زبان ہے۔

پچھلے ہزار سال میں لسانی تعلقات کے چار دَور

ہندستان کے پچھلے ایک ہزار برس میں سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی اور اُردو زبانوں کے باہمی تعلقات کی تاریخ چار دوروں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ پہلا دور کم و بیش بارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ سلطنتوں کے دربار سجتے ہیں۔ ان سلطنتوں کے گورنر اور منتظمین ملک کے مختلف حصّوں میں پھیلتے ہیں۔ ان سلطنتوں اور کچھ بعد مغل بادشاہوں کی فوجیں جن میں فارسی بولنے والے سپاہیوں کی کثرت ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں جاتی ہیں۔ بازار لگتے ہیں، کاروبار ہوتے ہیں۔ فارسی کا میل ہندی بلکہ یوں کہیے ہندی کی مختلف شکلوں سے ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ہریانوی میں فارسی کا میل، کھڑی بولی میں فارسی کا دخل، پوربی میں فارسی کی ملاوٹ اور دکنی زبانوں میں فارسی کا چلن۔ چونکہ فارسی بولنے والے لشکر یا اُردو، جنوبی ہند کو چھوڑ کر دیس کے باقی ہر حصّے میں پہنچ رہے تھے۔ اس لیے فارسی کا اثر شمالی ہند،

گجرات، بنگال اور دکن کی ساری ہی زبانوں پر ہو رہا تھا۔ مثلاً پچھلے دنوں میں نے گجرات کے شہر انند میں ایک جلسۂ تقسیم اسناد میں کچھ تقریریں گجراتی میں سنیں اور حسب ذیل فارسی الفاظ کو نوٹ کیا۔ حقیقت، ضروریات، صاحب، سرکاری، عمدہ، ضرور، تعلیم، ظاہر، مدد، بابت، نام، پسند، آخری، باد۔۔۔ وغیرہ۔ بحیثیت مجموعی لسانی رشتوں کا یہ پہلا دور فارسی اور ہندی کے امتزاج نزدیکی اور Convergence کا دور ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں امیر خسرو جیسے فنکاروں کا کام زبانوں کو آپس میں ملاتا ہے اور مثال کے طور پر ایسی غزل پیدا کر سکتا ہے جس میں ایک طرف ہندی اور دوسری طرف فارسی کے مصرعے ہیں:

زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
چوں تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بہ صد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
شبانِ ہجراں درازِ چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس دور میں اُردو زبان جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف ہندی کی مختلف شکلیں ہیں اور فارسی ہے۔ اور ان دونوں کا ساجھا ہوتا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ فارسی ہندی کا یہ امتزاج صرف الفاظ، محاورات اور طرز ادا تک محدود ہے۔ مگر ہندی گریمر اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور بدلنے نہیں پاتی۔

۲۔ جب اس دور کے کئی سو سال گزر جاتے ہیں تو ایک دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں شہروں، بازاروں، فوجوں، درباروں، عدالتوں، انتظامیہ، تجارت اور صنعت میں فارسی کا چلن کم ہوتا جاتا ہے اور اس کی جگہ وہ ہندی لینے لگتی ہے۔ جس پر پچھلے دور میں فارسی کا کافی اثر چڑھ چکا تھا۔ اس دور میں ہندی کی دو شکلیں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ ہندی جو دیہات میں رہی اور اس میں کہانیوں، پہیلیوں، محاوروں، کہاوتوں اور لوک گیتوں وغیرہ کی ایجاد ہوتی رہی۔ دوسری وہ ہندی جو شہروں میں آگئی اور فارسی کو دھیرے دھیرے

بے دخل کر کے عوام کی زبانوں پر چڑھنے لگی۔ مگر فارسی ہی زبان سے اور کہیں کہیں عربی سے لفظوں اور محاوروں کو لے کر اور اصطلاحات وضع کر کے ہندی میں ضم کرنے لگی۔ فارسی اور عربی سے لی ہوئی یہ اصطلاحات وہ تھیں جن کی بازاری کاروبار، تجارت وصنعت، قانون و عدالت میں، انتظامِ مملکت میں، دفتروں میں، درباروں اور فوجوں میں ضرورت تھی۔ شہری ہندی میں جوں جوں ان اصطلاحات کی بہتات ہوتی گئی اور شہری ثقہ پن یعنی Sophistication بڑھتا گیا۔ شہری ہندی اور دیہاتی ہندی کا فرق بڑھتا گیا اور شہری ہندی کو "ریختہ" یا "اُردو" کہنے لگے کیونکہ شروع میں فارسی اور ہندی کا یہ امتزاج لشکروں یعنی اُردو ہی سے شروع ہوا تھا۔ یہ دوسرا دور اردو اور ہندی کے بعد یعنی دوری اور Divergence کا دور ہے۔ یہ دور کوئی ڈھائی تین سو سال کا دور ہے جو عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام اور وضع اصطلاحات اور ان اصطلاحات کے چلن پر ختم ہوتا ہے۔

۳۔ آزادی کے بعد لسانی رشتوں کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں ہندی کو ہندستان کی سرکاری زبان بنایا جاتا ہے اور یہ زبان دیہات سے چل کر شہروں اور دفتروں میں پہنچ جاتی ہے۔ شروع شروع میں اس زبان کے سمجھنے میں کسی کو کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ مگر جب فنّی، سائنسی اور تکنیکی ضروریات کے تحت نئی اصطلاحات کی ضرورت پڑی، جو پڑنی تھی تو اب بجائے فارسی کے سنسکرت سے استفادہ کیا جانے لگا اور بڑی تعداد میں اس زبان کے الفاظ ہندی میں نافذ کیے گئے۔ چونکہ سنسکرت بھاشا ہزار سال سے زیادہ سے لوگوں کی زبان پر جاری نہیں تھی اور اپنے عروج کے زمانے میں بھی وہ عوام کی نہیں بلکہ خواص کی زبان تھی۔ علم کی زبان تھی اور علم عام نہیں تھا، اس لیے سنسکرت الفاظ و اصطلاحات کے ہندی میں داخل کیے جانے سے ہندی کے بولنے، لکھنے اور سمجھنے میں آسانی کا سامان فراہم نہ ہو سکا۔ بہرحال یہ وہ دور تھا جس میں ہندی اور اُردو میں پہلے سے زیادہ دوری ہو گئی۔ پچھلے ڈھائی سو سال میں فارسی عربی کی اصطلاحات اور الفاظ کے آنے سے ہندی اور اُردو میں بُعد ہو ہی چکا تھا مگر آزادی کے بعد ہندی میں سنسکرت الفاظ و اصطلاحات کے لیے جانے سے یہ تفاوت اور بڑھ گیا۔ یہ ہندی اُردو کی دوری کا یعنی Divergence کا دور تھا۔

۴۔ ادھر کوئی دس پندرہ سال سے ایک چوتھا دور شروع ہوا ہے جو اُردو اور ہندی کی نزدیکی یا Convergence کا دور ہے۔ اس دور میں یہ زبانیں بڑی حد تک ایک دوسرے سے قریب ہوتی جا رہی ہیں، اگرچہ ٹیکنیکل ٹرمنالوجی یعنی فنی اصطلاحات کے میدان میں فرق اور فاصلہ پہلے سے زیادہ ہے۔ اول تو اُردو والے ہندی کو زیادہ سیکھنے لگے ہیں۔ دوسرے لاکھوں بچے جن کی مادری زبان اُردو ہے اسکولوں میں ہندی پڑھ کر نکل رہے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہندی کی بہت ساری کہانیاں اور کچھ کویتائیں اُردو رسم الخط میں لکھی جا رہی ہیں اور اُردو والے ان کو پڑھنے لگے ہیں۔ چوتھے ہندی کی کچھ بحروں کو اُردو والوں نے اپنا لیا ہے اور اُردو کو شاعری کا حصہ بنا لیا ہے لیکن دراصل میل جول کی صورت ہندی کی طرف سے اب زیادہ پیدا ہونے لگی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہندی اور اُردو کی گریمر ایک ہے جو یگانگت اور ایکتا کا سب سے بڑا اور مستقل سبب ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندی میں خود اعتمادی کے بڑھ جانے سے اُردو کے Sophistication یعنی ثقہ پن کو ہندی والے اب پہلے کی نسبت زیادہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہندی خود شہروں میں آکر اسی Sophistication اور ثقہ پن سے گزرنے لگی ہے جس سے اُردو پہلے گزر چکی ہے۔ جس طرح شہری، تجارتی، صنعتی اور دانشورانہ ماحول کا اثر اُردو پر پڑ چکا تھا وہ اب ہندی پر بھی پڑ رہا ہے۔ ایک بہت بڑی قربت دونوں زبانوں میں اسی وجہ سے ہونے لگی ہے۔

اُردو کی رواداری اور سہل پسندی

شروع ہی سے اُردو زبان کی بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑا اور امتزاج پیدا کیا، دوسری زبانوں کے ساتھ بامروّت اور دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کے الفاظ کو جذب کر کے اپنے آپ کو مضبوط بنایا۔ اس طرح جب اُردو خود ایک روادار زبان بن گئی تو اس نے قومی اور انسانی رواداری اور یکجہتی کے خیالات کو فروغ دیا۔ آیئے پہلے زبان ہی کی سطح پر دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی اپنی رواداری اور امتزاج کے کیا معنی ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "آبِ حیات" میں ایک جگہ دلّی کے ایک شریف زادے کی بات چیت نقل کی ہے۔ یہ لڑکا بڑی روانی سے یہ کہتا ہے:

"میں بازار سے سیکل پر بیٹھ کر چلا گھر پہنچا چق اُٹھائی کمرہ میں داخل ہوا کمرے میں میز کرسی رکھی تھی لیمپ جل رہی تھی میں کرسی پر بیٹھ گیا۔"

اب ان جملوں کی ترکیب دیکھیے، پہلے تو ان کی گریمر ہندی اور جملوں کی بنیاد یعنی افعال سب ہندی ہیں۔ مثلاً میں چلا، گھر پہنچا، اُٹھائی، رکھی تھی، جل رہی تھی، بیٹھ گیا۔ باقی بازار فارسی، سیکل انگریزی، گھر ہندی، چق ترکی، کمرہ اطالوی، داخل عربی، میز پرتگیز، کرسی فارسی، لیمپ انگریزی یہ امتزاج یعنی Integration بھی عجیب وغریب ہے۔ اُردو نے بے شرمی کے ساتھ تمام بھاشاؤں سے شبد لیے، ان کو ایک لڑی میں پرو دیا ان کی مالائیں اور سمرن بنائے گلوں اور ہاتھوں میں ان کو پہنایا اور دلوں میں ان کو اُتارا۔ دیکھیے زبان کا پھیلاؤ اور Integration کس طرح سے ہوتا ہے اور ثقہ پن یعنی Sophistication کیسے بڑھتا ہے زبان کو شدھ رکھنے سے نہیں ہوتا، بھاشا کو Integration یعنی اپنے ہی Inward-Looking اندر گھٹی رکھنے سے نہیں ہوتا بلکہ نئے شبدوں، محاوروں اور طرزِ بیان کو اپنانے، اپنی زبان میں ضم کرنے اور ان کا فائدہ اُٹھانے سے ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کے ساری دنیا میں پھیل جانے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سری نگر، شملہ اور چنڈی گڑھ سے بنگلور اور حیدرآباد تک اور پٹنہ اور بنارس سے جے پور، احمدآباد اور بمبئی تک کروڑوں لوگ گلی کوچوں روزمرّہ کی زبان بول رہے ہیں اور مزے سے ایک دوسرے کی بات سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھاشا سرکاری بھاشا نہیں ہے بلکہ کئی سو برس کے امتزاج اور استعمال کا نتیجہ ہے۔ جب اُردو اپنے آپ کو دوسری بھاشاؤں کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ و محاورات کو اپنے اندر ضم کرکے اپنے آپ کو مال دار بنا چکی تو اس نے اس رواداری کے رجحان کو باقی رکھتے ہوئے ایسا طرزِ بیان اپنے اندر پیدا کیا کہ اس کا جواب مشکل سے ملتا ہے۔ ترسیل یعنی Communication کا سلیقہ اس زبان سے بہم پہنچایا اور لین دین کے ایسے طریقے ایجاد کیے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی جگہ بننے لگی اور عوام نے دھیرے دھیرے اُردو کو اپنا کر فارسی کو بے دخل کر دیا۔ اُردو کے

اکثر و بیشتر شعرا اور مصنّف Communicate کرنے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے بلکہ دل نشین کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مشکل پسندی اور مشکل گوئی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے برخلاف آسان گوئی کو سراہا جاتا ہے اور فصاحت، سلاست، روانی اور سہل البیانی کی تعریف کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو نظم اور نثر کے لکھنے والوں میں مشکل گو اور مغلق لکھنے والے بھی ملتے ہیں۔ خود مرزا غالب کے کئی اشعار مشکل گوئی کا نمونہ ہیں:

شمارِ سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

یا یہ کہ:

ہوں گرمیِ نشاطِ تخیل سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

واقعی کتنا اچھا لیکن کتنا مشکل شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب مرزا غالب کی مشکل پسندی پر طعنے کسے جانے لگے اور شکایت مرزا تک بھی پہنچی تو انھوں نے وہ مشہور قطعہ کہا:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

چند مشکل پسندوں سے قطع نظر اُردو کے ادیبوں اور شعرا نے اور دوسرے بولنے اور لکھنے والوں نے اگر ایک طرف بڑی تعداد میں دوسری زبانوں سے الفاظ و محاورات اخذ کیے اور ان کو بار بار استعمال کر کے جِلا دی تو دوسری طرف فنِ ترسیل یا Communication کے ذریعے دوسروں تک اپنی بات پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بات وہ اچھی سمجھی جاتی تھی کہ دل سے نکلے اور دل تک پہنچ جائے بلکہ دل نشین ہو جائے۔ مولوی علی حیدر نظم طباطبائی نے جو Gray's Elegy کے ترجمے کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہوئے۔ ایک جگہ شعر کی تنقید کے سلسلے میں لکھا ہے۔ "جس شعر کے معنی میں اُلجھن پڑ جائے اور نکتہ سنج طبیعتیں اس کی تفسیر میں بحث کرنے لگیں۔ سمجھ لو شاعر ادا نہ کر سکا۔" دل کی بات دل تک پہنچانے کا فن اُردو والوں میں بڑا ہر دلعزیز ہوا۔ یہاں تک کہ سہل ممتنع کو نظم کی اعلا صفت سمجھا جانے لگا۔ سہل ممتنع یعنی Limiting Case of Simplicity نظم کی وہ خصوصیت ہے کہ اگر اس نظم کو نثر میں تبدیل کرنا

چاہیں تو نہ کرسکیں. اساتذہ شاگردوں کی غزلوں اور نظموں کی اصلاح میں سہل ممتنع کی تلقین کرتے تھے اور خود بھی اسی روش پر چلتے تھے. مثلاً داغ دہلوی:

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں
کچھ دیکھ رہے ہیں دلِ بسمل کا تڑپنا کچھ غور سے قاتل کا ہنر دیکھ رہے ہیں

یا ایک اور جگہ:

عذر آنے میں بھی ہے پاس بلاتے بھی نہیں
باعثِ ترک ملاقات بتاتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

میر تقی میر زبان کے چٹخارے کے ساتھ سہل بیانی کا کمال یوں دکھاتے ہیں:

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے ادھر آبے! ابے او چاک گریباں والے

یا پھر یہ کہ:

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ

صرف دہلوی شعرا کی بات نہیں شاعر دلی کا ہو یا لکھنؤ یا کسی اور جگہ کا. توجہ بہر حال ترسیل اور Communication ہی کی طرف ہوگی. چنانچہ بزم لکھنوی کہتے ہیں:

سچ کہو کس نے لیا دل کہ جو پایا نہ گیا
یاں ہمیں تم ہیں کوئی اور نہ آیا نہ گیا

اس غزل میں نعتیہ شعر کس روانی سے کہے گئے ہیں:

ایک شب عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا
ہجر وہ غم ہے خدا سے بھی اُٹھایا نہ گیا

سہل بیانی کے سلسلے میں غالب جیسے مشکل پسند کو بھی مشکل پیش آئی اور آسان بیانی کی طرف جھکنا پڑا چنانچہ:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

بہرحال اُردو شاعری میں صفحوں کے صفحے اور دیوان کے دیوان سہل ممتنع سے بھرے پڑے ہیں۔ میر انیس کے ایک بند میں جو ایسے ہزاروں بندوں میں سے ایک ہے سہل البیانی ملاحظہ فرمائیے:

اک بھائی کے مرتے ہی بڑھا دوسرا بھائی
اس نے بھی لڑائی میں بہت جان لڑائی
مہلت نہ مگر ہاتھ سے نوشاہ کے پائی
آیا وہ اُدھر سے کہ اِدھر سے اجل آئی
ڈھونڈا کیے قاسم بھی کہ کیا ہو گیا دشمن
اک برق سی چمکی کہ فنا ہو گیا دشمن

یا ایک اور بند کی سلاست دیکھیے:

جنگ میں تیغ کو دعوا تھا کہ یکتا ہوں میں
سر اُٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں
چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا ہوں میں
برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ یا ہوں میں
کس کی ہے یہ جو تڑپ زیرِ فلک میری ہے
تیغ کرتی تھی اشارہ یہ چمک میری ہے

سہل ممتنع کی بہترین مثالوں میں سے ایک مثال استاذ ذوق کی ایک غزل ہے۔ ساری غزل کا ایک ہی مزاج ہے کہ زندگی اور موت کے بنیادی مضامین پر ایک فلسفہ بیان کیا گیا، وہ بھی اس درجہ سلاست کے ساتھ کہ ایک لفظ اِدھر کا اُدھر نہیں ہو سکتا اور نظم کو نثر نہیں کیا جا سکتا آپ سب حضرات اس غزل سے پوری طرح واقف ہیں لیکن سہل ممتنع کی اعلا مثال کے طور پر اس کو پھر ملاحظہ فرمائیے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ — تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ — ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ — اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

آسانیِ بیان اور سہل ممتنع کی یہ روش صرف متقدمین اور متاخرین ہی تک محدود نہ تھی بلکہ حالیہ دور میں بھی جاری ہے آج بھی اُردو والوں میں Communication پر بہت زور ہے۔ مثلاً رگھوپتی سہائے فراق جو کچھ دنوں پہلے تک ہمارے ساتھ تھے، فرماتے تھے:

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
لاکھ کر ظلم و ستم لاکھ کر الطاف و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

عدمؔ کہتے ہیں:

اس طرح عہدِ شباب آ کے گزر جاتا ہے — جس طرح رنگ کھلونوں سے اُتر جاتا ہے
یوں تو ہلتا ہی نہیں گھر سے کسی وقت عدمؔ — شام کے وقت نہ معلوم کدھر جاتا ہے

یا پھر عدمؔ ہی کے شعر:

آ اے غمِ دوراں درِ مے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے
جنّت میں نہ مے ہے نہ محبت نہ جوانی
کس چیز پہ انساں بسر اوقات کریں گے
کہہ دو یہ عدمؔ سے کہ خرابات میں کل رات
کچھ لوگ فقیروں کی مدارات کریں گے

یا احمد فرازؔ کے مشہور اشعار:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

یا ان ہی کا ایک اور شعر پیش ہے:

سانسوں میں بھی شامل ہو لہو میں بھی رواں ہو
لیکن مرے ہاتھوں کی لکیروں میں کہاں ہو

بہرحال اپنی بات کو سلاست اور فصاحت کے ساتھ اس طرح کہنا کہ دل سے دل کا معاملہ ہو جائے تہذیب کا ایک اہم پہلو ہے اور اُردو نے اس خاصیت کو اپنا مزاج بنا رکھا ہے۔ چاہے اور زبانیں اپنے آپ کو کتنا ہی شدھ اور وقت پسند بنالیں لیکن اُردو کو اپنی آسان اور Communication والی روش پر چلتے ہی رہنا ہے:

ان کی طبیعت ان کی طبیعت ہوا کرے
قاصد مرا مزاج بھی میرا مزاج ہے

خود یہ شعر بھی سہل ممتنع ہی کی تعریف میں آتا ہے۔

خواتین وحضرات، میرا یہ ایقان ہے کہ ہندستان کے مختلف علاقوں، زبانوں، نسلوں اور مذاہب کے درمیان اگر رواداری کو قائم کرنا اور بڑھانا ہے اور قومی یکجہتی کی فضا کو ہموار کرنا ہے تو اُردو زبان سے بہتر کوئی حربہ اس کارِ عظیم کے کرنے کا نہیں ہے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اور زبان ہے جو قومی یکجہتی کا کام کرسکتی ہے تو وہ ہندی زبان ہے۔ اگرچہ جس قسم کی ہندی پچھلے ۳۵ یا ۴۰ سال سے اس ملک میں بڑھاوا پا رہی تھی اس کے بارے میں بھروسے کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ یکجہتی کو بڑھانے کی زبان ہوگی۔ ایک طرف تو یہ زبان بجائے رواداری کے کٹّرپن کی طرف جارہی تھی اور بجائے دوسری زبان سے الفاظ اخذ کرنے کے Parism یعنی شدھ پن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حکومتی پالیسی کچھ ایسی دکھائی دیتی تھی کہ بجائے لوگوں کے دلوں میں ازخود گھر کرلینے کے کئی علاقوں

ہیں اس زبان کو لوگوں پر تھوپا جا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے کئی حصّوں' خاص کر دکھنی بھارت میں اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہوا اور اس کو روکنے کے لیے دیواریں اور فصیلیں کھڑی کر لی گئیں مگر ادھر پانچ سات سال سے ہندی میں جو نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری زبانوں سے الفاظ حاصل کر کے اپنے آپ کو مالا مال کرنے کی جو روش چل پڑی ہے اور اپنے شہری جنم میں جس Sophistication یا ثقہ پن سے ہندی گزر رہی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہندی کا بھی وہی رنگ ہوگا جو اُردو کا ہے اور لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے اور قومی یکجہتی کو بڑھانے کے بڑے کام یہ زبان بھی اسی طرح کر سکے گی جیسے کہ اُردو کرتی آئی ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ جب ہندی اس موقف میں آئے گی کہ قومی یکجہتی کے کام کو کر سکے تو اس کی شکل اس ہندی سے۔ بہت ملتی جلتی ہوگی بلکہ جڑواں بہنوں کی طرح ہوگی یا ایک سی ہوگی سوائے اس کے کہ ان کا ٹیکنیکی لباس اور فن اصطلاحات کے دائرے میں ان کا رنگ الگ الگ ہوگا۔

اُردو شعرا اور ادیبوں کے ثقافتی معیار

منافقت اور کٹر پن سے بیر

پچھلے کئی سو برس میں جب اُردو زبان اپنے آپ کو دوسری زبانوں کے الفاظ محاورات اور طرزِ ادا کے ذخیروں سے مالا مال کر رہی تھی اور خود اپنی رواداری کو مستحکم کر رہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ وہ قومی رواداری بلکہ انسانی رواداری اور یکجہتی کا ایک زبردست آلۂ کار بن بیٹھی تھی۔ یوں سمجھیے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اندرونی امتزاج یا Integration کو مضبوط کر رہی تھی تو دوسری طرف قومی اور انسانی امتزاج کا سامان مہیا کر کے باہر کی فضا کو سازگار بنا رہی تھی۔ یکجہتی اور رواداری کی یہ روش اُردو پر کہیں باہر سے تھوپی نہیں گئی اور نہ رواداری کسی پر تھوپی یا لادی جا سکتی ہے۔ اُردو کا یہ دوستانہ مزاج اس کی اپنی اندرونی اُپج ہے اور روزِ اوّل ہی سے اس کی ساخت اور اُٹھان کا ایک اہم حصّہ ہے۔

مزاج لڑکپن سے دوستانہ تھا۔ شروع ہی سے اُردو زبان رومی کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر رہی ہے کہ

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اُردو کی بے تعصبی کا جائزہ لیتے وقت یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اس کے شعرا، ادیبوں اور مصنفین نے کٹرپن اور تعصب سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ نہ ان کو مذہب سے بیر تھا نہ علمائے مذہب سے۔ فقیری اور صوفی منشی کے تو وہ دلدادہ تھے۔ اگر بیر تھا تو ان کو کٹرپن سے تھا۔

دین و مذہب کے نام پر ڈھکوسلے اور منافقت کو وہ سہہ نہ سکتے تھے، اُردو شاعر چاہے کسی دور کا ہو شیخ و برہمن پر طنے کسے گا، ریاکار واعظ پر لعنت بھیجے گا، زاہد خشک کا مذاق اُڑائے گا، محتسب سے نفرت کرے گا اور ناصح کی نصیحتوں کو ٹھکرا دے گا۔ مسجد و بُت خانہ حرم و دیر دونوں ہی سے وہ بیزاری کا اظہار کرے گا اور میخانے کو اپنی منزلِ مقصود سمجھے گا۔ اُردو شاعر کا اعتراض مذہب پر نہیں ہے بلکہ چند مذہبی اجارہ داروں کی دو عملی، کٹرپن، تعصب اور منافقت پر ہے۔

یہ مسجد ہے وہ میخانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ہنسی شاعر کو اس پر آتی ہے:

پہلے تو آ کے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر   پھر سر جھکا کے داخلِ میخانہ ہو گیا

واعظ کے وعظ سے وہ بیزار ہے اور ناصح کی نصیحتوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔

شیخ و برہمن، واعظ و ناصح، زاہد و محتسب سب کے خلاف میر تقی میر سے فیض احمد فیض تک اُردو شعرا نے آواز اٹھائی ہے اور طنز و مزاح کے پردے میں ان سب کی پگڑیاں اُچھالی ہیں۔ چنانچہ ایک سہ ستھری غزل میں جس کا مطلع ہے:

مُطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو   مدت تلک اک وجد سی حالت رہی سب کو

میر جی فرماتے ہیں:

برسوں تئیں جب ہم نے تردد کیے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

ایک اور جگہ:

شیخ جی آؤ مصلّٰی گرد جام کرو
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
سایۂ گل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو
آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو
جا کے تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبحِ گلستان میں بھی شام کرو

ناصح اور واعظ کے تو شعرا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے:

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
کر شراب و کباب کی باتیں

مصحفی اپنے محبوب سے کہتے ہیں:

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

مرزا داغ جب بڑی دیر تک ناصح کی نصیحت سن چکے تو کہنے لگے:

ناصحا تو بھی کسی پر جان دے
ہاتھ لا اُستاد! کیوں؟ کیسی کہی!

شیخ اور محتسب کے بارے میں فیض کا رویہ پہلے تو ڈھٹائی کا ہے:

شیخ سے بے حجاب ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

مگر پھر یہ شکایت ہے کہ:

کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کمتر جاتی ہے

یکجہتی، بے تعصبی اور کشادہ دلی

اس قسم کے ایک حد تک منفی طنز و مزاح اور بیزاری سے ہٹ کر ہر زمانے کے اُردو شعرا نے رواداری، یکجہتی، بے تعصبی اور کشادہ دلی کی جو مثبت تلقین کی ہے اور یکسانیت، رفاقت اور دردمندی کا جو فلسفہ ایجاد کیا ہے اس کے مدِّنظر تو میں اس لکچر کا عنوان "اُردو کا دوستانہ مزاج"

رکھنا چاہتا تھا مگر چونکہ مجھے دوستانہ مزاج کے علاوہ اُردو شعر و نثر کی کچھ اور خصوصیات حاضرین کے گوش گزار کرنی تھیں اس لیے عنوان وہ رکھا جو اب ہے۔ فی الحال یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو اپنے اندر رواداری اور دردمندی کی صفت نہیں رکھتا وہ مہذّب نہیں ہوسکتا۔ تہذیب کے لیے رواداری شرط ہے اور مہذّب وہی ہوگا جو روادار اور Tolerant ہوگا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش خدمت ہے کہ قومی یا انسانی یکجہتی کی مہم کو چلانے کے لیے چلانے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ خود بھی یکجہتی کا مزاج رکھتا ہو اور انصاف پسند شخصیت کا حامل ہو۔ جو خود integrate نہ ہوچکا ہو وہ دوسروں کو کیا integrate کرسکتا ہے۔

او خویشتن گم است کجا رہبری کند

اُردو کے ادیب اور شاعر اور اس کے بولنے اور ماننے والے عام طور پر اس خیال کے حامی رہے کہ اپنے مسلک کو مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے لیکن دوسروں کو بھی اس کے مسلک پر چلنے کا پورا حق دینا چاہیے۔ جب اس بات کو مان لیا جائے کہ دوسرے کو اپنے مسلک پر چلنے کا پورا حق ہو تو رواداری کا راستہ خود ہی قائم ہوجاتا ہے۔ غالب نے اس نکتے کو کس خوبی سے سمجھایا ہے کہ ایمان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف اپنی روش کو ایمان اور دوسرے کی روش کو بے ایمانی سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک برہمن دل کی لگن کے ساتھ اپنے بُت کی سیوا کرتا رہا اور اپنے مسلک کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے بُت خانے ہی میں مرگیا تو اس قابل ہے کہ کعبے میں دفن کیا جائے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اپنی بات پر قائم رہنے اور دوسرے کے ساتھ رواداری برتنے کے مضمون کو دکن کے ایک صوفی شاعر غالباً حسین شاہ ولی نے کس عمدگی سے دلنشین کیا ہے۔ کہتے ہیں:

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دلآرام بھلا

فارسی والوں کی طرح اُردو والے بھی عام طور پر کٹرپن اور تعصّب کے خلاف اپنا بخار

مسجد و بُت خانہ یا دیر و کعبہ پر نکالتے ہیں مثلاً؛

کل جو مسجد میں جا پھنسے مومن رات کاٹی خدا خدا کر کے

اور جب کٹڑپن سے تنگ آجاتے ہیں تو رندی کے مسلک اور مے خانے کے ماحول کو سراہنے لگتے ہیں۔ میخانے کے شیدائیوں میں ہزاروں اُردو والے ایسے ہیں جنھوں نے کبھی میخانے کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے نہ تو شیشہ و ساغر، نہ ساقی و پیمانہ، نہ مغبچہ و پیر مغاں سے نسبت رکھی اور نہ کبھی شرابِ ناب کا مزا چکھا ہے۔ مگر خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا۔ دیر و کعبہ اور مسجد و بُت خانہ کے خلاف میخانے کا تصور ہی کچھ اتنا دلچسپ ہے کہ اُردو کا تقریباً ہر شاعر اس کی طرف مائل ہے۔ میخانہ وہ جگہ ہے جہاں ذات پات، مذہب و ملت، رنگ و نسل اور ملک اور علاقے کے فرق مٹ جاتے ہیں۔ ساغر و مینا میں گھل جاتے ہیں اور شرابِ ناب سے دُھل جاتے ہیں۔ چاہے کوئی دراصل شراب پیے یا نہ پیے۔ میخانہ دوستی اور ملنساری کی ایک علامت یا Symbol ہے اور عصبیت اور منافقت کے خلاف ایک علم احتجاج ہے۔ دیکھیے مختلف شعرا نے اسی مضمون میں کیا کیا گُل کھلائے ہیں:

کوئی کافر کی طرح کوئی مسلماں کی طرح لوگ اس دور میں ملتے نہیں انساں کی طرح

کوئی کافر ہیں سمجھے کہ مسلماں سمجھے ہم محبت کو تری حاصلِ ایماں سمجھے

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اور پھر ریاض خیر آبادی کا سیکڑوں اشعار کا نچوڑ یہ ایک شعر کہ:

جنابِ شیخ سے کہہ دو اگر سمجھانے آئے ہیں

کہ ہم دیر و حرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں

مذہبی، قومی اور انسانی رواداری کی اس سے بہتر مثال اور کیا مل سکتی ہے کہ اُردو کے ہندو اور مسلمان شعرا، مصنفین اور مترجمین نے ایک دوسرے کے مذہبی عقائد کا احترام کیا اور ایک دوسرے کی آسمانی یا آفاقی کتابوں پر نظمیں لکھیں اور ان کے ترجمے کیے۔ ہندو اور مسلمان شعرا، ادیبوں اور مترجمین نے رامائن، مہا بھارت، اپنشد اور بھگوت گیتا کے یا تو ترجمے کیے یا ان کے خیالات کو اپنے ادب میں ضم کیا اگر دوارکا پرشاد افق اور شنکر دیال فرحت نے رامائن کا

طوطا رام شایاں نے مہابھارت کا، جگن ناتھ خوشتر نے بھگوت پران اور رامائن کا اور رام سہائے تمنّا نے بھگوت گیتا کا اُردو میں ترجمہ کیا تو خواجہ دل محمد نے بھی گیتا کا منظوم ترجمہ اسی زبان میں کیا جیسا کہ اس سے پہلے فیضی نے فارسی زبان میں کیا تھا۔ اگر بنواری لعل شعلہ نے برج بھب لکھی تو خواجہ حسن نظامی نے کرشن بنسری تصنیف کی اور حسرت موہانی نے اپنی غزلوں میں کرشن جی، گوکل متھرا اور برج کے مضامین باندھے۔ نظیر اکبر آبادی نے ہولی اور دیوالی پر اور کرشن جی پر کئی نظمیں کہیں تو اقبال نے رام، رام تیرتھ اور گرو نانک پر۔ اسی طرح ہندو شعرا اور ادیبوں نے حمد خدا، نعتِ رسول اور منقبت پنجتن کو اپنی نظموں کا اہم حصّہ بنایا۔ دیکھیے پنڈت دیا شنکر نسیم کی معرکتہ الآرا مثنوی یعنی مثنوی گلزارِ نسیم، حمد و نعت، منقبت و دعا کے ساتھ کس شان و شوکت کے ساتھ شروع ہوتی ہے:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری	ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر	حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے	یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
یارب مرے خامے کو زباں دے	منقارِ ہزار داستاں دے
ہر چند اگلے جو اہلِ فن تھے	سُلطانِ قلمروِ سخن تھے
آگے ان کے فروغ پانا	سورج کو چراغ ہے دکھانا
پر بحرِ سخن سدا ہے باقی	دریا نہیں کار بندِ ساقی
طعنے سے زبانِ نکتہ چیں روک	رکھ لے مری اہلِ خامہ میں نوک
جو نکتہ لکھوں کہیں حرف آئے	مرکز پہ کشش مری پہنچ جائے

اُردو عوام کی سرپرستی میں ترقی کرتی ہے

کسی بھی زبان کی نشوونما کے لیے کسی نہ کسی سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سرپرستی کبھی شاہی دربار امرا اور خواص سے ملتی ہے تو کبھی عوام سے، اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی ہندستان میں رسائی ضرور تھی۔ لکھنؤ اور فیض آباد، رام پور اور بھوپال کے

دربار، سلاطین دکن اور خصوصاً نظام حیدرآباد کا دربار اور دلّی میں خاص طور پر بہادر شاہ ظفر کا دربار اُردو زبان کے اہم گہوارے تھے۔ کہیں کہیں بادشاہ بھی شعر کہتے تھے اور چند درباری بھی، غزل گوئی بھی ہوتی تھی اور قصیدہ خوانی بھی۔ قصیدہ کی صنف اگر دربار میں نہ اُبھرتی تو اور کہاں اُبھرتی۔ استاد ذوق کے قصیدے اپنی آپ نظیر تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں ایک قصیدے کی اُٹھان ملاحظہ ہو:

بعد شاہان سلف کے تجھے یوں ہے تفضیل
جیسے قرآن پس توریت و زبور و انجیل

مگر دوسرے درباروں میں بھی قصیدہ خوانی کا کافی عروج ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ قصیدہ خوانی بغیر مبالغہ آمیزی کے نہیں ہوسکتی تھی مگر اس سے قطع نظر الفاظ کی شان و شوکت اور دبدبہ پر قصیدے میں بہت زور ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر مولوی علی حیدر نظم طباطبائیؔ کے قصیدے سے دو بند پیش کرتا ہوں جو نظام حیدرآباد کی تعریف میں کہے گئے تھے، واضح رہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا زمانے نے اس کو بالکل اُلٹا کر کے دکھایا۔

ترا ہر حکم محکم بڑھ کے ہو سدِّ سکندر سے
جہاں کے خشک و تر پر تیرا بارانِ کرم برسے
ترے انصاف و عدل و رافت مظلوم پرور سے
فلک کانپے زمیں لرزے جفا بھاگے ستم ترسے
دہائی تیری ہو عالم میں اور تو داد گستر ہو
سدا ڈنکا بجے بالِ ہما کا چتر سر پر ہو

تجھے اے آصف سابع ملے اوجِ سلیمانی
دکن کو تیرے دم سے ہو سدا دعوائے کنعانی
رہے مجرائیوں میں شان فغفوری و خاقانی
درِ دولت پہ تیرے فخر ہو دارا کو دربانی
یہ چوکھٹ سجدہ گاہ تغلق و محمود و سنجر ہو
یہ وہ گھر ہو جہاں آئینہ داروں میں سکندر ہو

مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ اُردو کی نشوونما اور اس کا عروج درباروں کی سرپرستی میں بہت کم ہوا اور عوام کی سرپرستی میں کہیں زیادہ۔ مانا کہیں کہیں کوئی مرزا، رفیع، سودا یا انشا اللہ خاں کوئی ذوق یا غالب کوئی داغ یا امیر مینائی درباروں کی سرپرستی میں قصیدے اور غزلیں کہہ لیتے تھے۔ مگر اُردو شعرا کی ۹۰/۹۵ فیصد تعداد دربار سے متعلق نہیں تھی۔ مرزا غالب کی دربار میں رسائی تو رہی مگر ان کی زیادہ تر غزلیں اور بہترین غزلیں دربار سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں۔ جو اشعار غالب کی شاعری کا نچوڑ اور طرۂ امتیاز نہیں، وہ دربار کی فضا میں پنپ ہی نہ سکتے تھے۔ مثلاً یہ شعر جس میں غالب نے وصل کو بجائے ایک جسمانی خواہش کے ایک فکر یا Concept بناکر پیش کیا۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

یا پھر جب دلّی اُجڑ گئی۔ دربار ختم ہوا لیکن پھر بھی لوگ جھوٹی امیدوں پر جیتے تھے کہ تخت و تاج واپس مل جائے گا تو غالب نے نیم مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

یا پھر آزادی کے سلب ہو جانے اور انگریزوں کے دلّی پر قبضہ کر لینے کے بعد آزادی کی جو چھوٹی موٹی کوششیں ہو رہی تھیں، ان کی طرف یہ نازک اشارہ ہے:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

عام طور پر اردو کے شعرا اور ادیب دربار سے کم اور فقیری، صوفی منشی اور علم و ہنر سے زیادہ متعلق تھے۔ ان میں سے چند عالم تھے تو علمائے دربار کی صف میں نہیں بلکہ علمائے راسخ کی صف میں آتے تھے۔

تصوّف کا اثر

اُردو شاعری پر تصوّف کا بڑا گہرا اثر ہے اور امیر خسرو ہی کے وقت سے اُونٹ

اس کروٹ بیٹھ چکا تھا۔ اس طرح خواص کی نسبت عوام کی سرپرستی کا اُردو شاعری پر بہت زیادہ اثر رہا۔

عام تحریر و تقریر کے علاوہ محفل مشاعرہ ایک ایسی زبردست ایجاد تھی کہ اس میں خواص و عوام سب ہی آتے تھے۔ مشاعرہ کوئی Poetry Society نہ تھا جس میں یورپی ملکوں میں صرف خواص کی جگہ ہوتی تھی۔ مشاعرے میں خواص بھی ہوتے تھے مگر ناممکن تھا کہ کسی اچھے یا اوسط درجہ کے شاعر کو صرف اس لیے مشاعرے میں جانے سے روکا جائے کہ وہ نادار ہو۔ میر تقی میر جیسے غریب الوطن بھی لکھنؤ کے نانکون اور رئیسوں کے مشاعرے میں پہنچ گئے۔ شاعر غریب ہو یا امیر ہو شمع محفل برابر اس کے سامنے آتی تھی اور اچھے شعر پر وہ داد کا برابر مستحق ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشاعروں کے ذریعے سے اچھی زبان کے سننے، بولنے اور لکھنے پر عوام کو بڑی دسترس ہوگئی اور اُردو زبان نے جمہوری شکل اختیار کرلی۔

یہی صورت محرم کی مجلسوں اور درگاہوں اور خانقاہوں میں قوالی کی محفلوں کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ نہ صرف لکھنؤ بلکہ تمام شہروں میں عوام جوق درجوق مجالس عزا میں جاتے تھے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ میں ایامِ عاشورہ کے دوران انیس و دبیر اور دوسرے اساتذہ اور ذاکرین کو ہزاروں لوگ سن لیتے تھے اور بار بار سنتے تھے۔ مشاعرے سے بھی کہیں زیادہ مجالس میں عوام کی پہنچ تھی اور کسی کو وہاں جانے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ شرکت کے لیے مال و جائداد کی شرط نہ تھی اور مجلس عزا بھی ایک جمہوری ادارہ بن گئی تھی جس کے ذریعہ زبان کی لطافتیں اور نزاکتیں، محاورے صنائع و بدائع اور اونچے خیالات ہر کس و ناکس تک پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح عوام کی سرپرستی اُردو کو بڑے پیمانے پر ملنے لگی تھی۔ غور فرمائیے کہ جب ہزاروں کی مجلس میں میر انیس نے حسب ذیل بند پڑھا ہوگا اور عوام و خواص سے داد لی ہوگی تو زبان کی ہر دل عزیزی کس درجہ پر پہنچ گئی ہوگی:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے گیسو کے لیے   سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے

حُسن ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

انیس اور دبیر کے کلام میں جب ایسے معرکے کے بند آتے ہیں تو مجالس اور محفلوں کے ماحول کا خیال کر کے میں اکثر سوچا کرتا ہوں:

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جس وقت یہ مے تو نے شیشے میں بھری ہوگی

عوامی تحریکیں اور اقدار

رواداری، بے تعصبی اور یکجہتی کی قدروں کو فروغ دینے کے علاوہ وہ کون سی بڑی تحریک ہے جو اُردو زبان میں نہ چلی ہو۔ سامراجیت سے ملک کو آزاد کرانے کی تحریک، آزادی حاصل کرنے کے بعد اس کو باقی رکھنے کی تحریک، اس میں سماجی اور معاشی بہتری لانے کی تحریک، سرخ انقلاب کی تحریک، ترقی پسندی کے عنوان کے تحت کئی تحریکیں، مثلاً کسان مزدور تحریک، آزادیِ خیال کی تحریک اور کئی چھوٹی بڑی تحریکیں اس زبان میں مختلف زماں و مکاں میں چلتی رہیں۔ ان دریاؤں کو اگر کوزوں میں بھی بند کیا گیا تو کوزے اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ ان میں سے دریا پھوٹ نکلیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور نہ اتنا علم کہ تفصیل میں جا کر بتاؤں کہ زبانِ اردو کا سہارا لے کر ان تحریکوں کے بانیوں اور کرتا دھرتاؤں نے کیا کیا کام کیے۔ مختصر وقت میں صرف چند جھلکیاں ہی پیش کر سکتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ چھوٹی بڑی اقدار کو اٹھانے میں اور تحریکوں کو آگے بڑھانے میں اُردو والوں نے کیا کیا کام کیے مگر مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ اس وسیع موضوع کا حق یہاں بہت کم

ادا ہوسکتا ہے۔ بقول انیس :

دریا اگرچہ سارے سیاہی سے ضم کروں
کاغذ بجائے تختۂ گردوں بہم کروں
لکھنے کو بیٹھیں حور و ملک انس و جن تلک
عشر عشیر ہو نہ قیامت کے دن تلک

تحریکِ آزادی میں اردو شعرا اور ادیبوں کا کام اتنا وسیع ہے کہ اس موضوع کو پوری طرح حذف کردیتا ہوں۔ مگر آزادی کے بعد اس کو باقی رکھنے میں جو جو رخنے پیدا ہو رہے تھے ان کی نشان دہی کرنے اور ان کو بند کرنے کی تلقین کرنے میں اُردو والے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ جب جب اور جہاں جہاں جمہوریت اور آزادی کی قدروں پر اور آزادیِ خیال و بیان پر ضرب لگنے کا خطرہ پیدا ہوا ہے تو اُردو کے ادیبوں اور شعرا نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ مثلاً انور صابری :

میکدے پر بھی سیاست کا اثر چھانے لگا
خلوتِ ساقی میں واعظ بھی نظر آنے لگا
کیا قیامت ہے بنامِ دعوتِ ابرِ بہار
گلستاں کا ذرّہ ذرّہ آگ برسانے لگا
جب زبانِ شوق پر پابندیاں بڑھنے لگیں
وقت خود ناگفتنی افسانہ دُہرانے لگا
دورِ پیمانہ کے بدلے ان دنوں پیرِ مغاں
اہتمامِ گردشِ ایّام فرمانے لگا
نغمگی میں دب کے انور رہ گئی تنقیدِ شعر
نغمہ خواں ہر گیت پر دادِ غزل گانے لگا

ترقی پسند شعرا اور ادیبوں نے مزدور اور کسان کو اس کا حق دلانے، غریبی سے ملکوں کو نکالنے اور تقسیم آمدنی و دولت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جد و جہد نہ کی۔ کسی نے انقلاب کا راستہ ڈھونڈا تو کسی نے رفارم کا۔ ان شعرا نے Ideology ہی کو محبوبہ بنا لیا اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں کا رتبہ دیا۔ پنگھٹ کی ڈگر بہت کٹھن تھی مگر نہ ہمت ہاری نہ ناامید ہوئے۔ مثلاً فیض:

ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے یہ اکرام ہی تو ہے
دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایّام ہی تو ہے

یا یہ کہ:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
سامانِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیِ ایّام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا
دل ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
میخانہ سلامت ہے تو پھر سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

یا یہ کہ :

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزدوں کو قرار آگیا
جیسے امید فصلِ بہار آگئی جیسے پیغام دیدار یار آگیا
سر فروشی کے انداز بدلے گئے، مقتل شہر میں دعوت قتل پر
ڈال کر کوئی گردن میں طوق و رسن لاد کر کوئی کندھے پہ دار آگیا
فیض کیا جانیے آج کس بات پر منتظر ہیں کہ آئے گی کوئی خبر
میکشوں پر ہوا محتسب مہرباں، سرفروشوں پہ قاتل کو پیار آگیا

مخدوم محی الدین نے اپنی نظم رقاصہ کو اس بیت پر ختم کیا ہے :

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ رقاصہ سے کیا مراد ہے۔

مخدوم ترقی پسندی کے ناطے اور کمیونسٹ پارٹی کے اہم رکن ہونے کے ناطے پنڈت نہرو اور حکومت کی کئی پالیسیوں کے سخت مخالف تھے اور کھل کر تنقید کرتے تھے مگر اُردو کے شاعر عثمانیہ یونیورسٹی کے سپوت اور حیدرآباد کے شہری ہونے کے ناطے رواداری کا دامن چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ پنڈت جی کے انتقال پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور وہ مشہور نظم کہی :

ہزار رنگ ملے اس سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل وگل کا غبار مشتِ غبار
ہوا ہے وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

مخدوم نے اپنی زندگی کی آخری شام چند دوستوں کے ساتھ گزاری جن میں مجھے بھی شریک ہونے کا فخر تھا۔ رات کے کوئی بارہ بجے محفل کو اس مضمون پر ختم کیا :

دوستو ہاتھ میں ہاتھ دو سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی منزلیں دار کی کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو

اُردو اور ہندی کی قربت اور مستقبل

ہر زبان کی کچھ جذباتی یعنی Emotional ضروریات ہوتی ہیں جن کو پورا کیے بغیر زبان پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اس سلسلے میں میں اپنے ذاتی تجربات کا ذکر کرنے کی معافی چاہتے ہوئے دو ایک چیزیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دن مدھیہ پردیش کی روی شنکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اور یونیورسٹی کا نوکیشن ایڈریس دینے کی فرمائش کی میں نے عرض کیا کہ روی شنکر یونیورسٹی تو ایسے علاقے میں ہے جو ہندی کا گڑھ ہے وہاں شدھ ہندی بولی جاتی ہے اور ایسی ہندی مجھ کو نہیں آتی۔

انھوں نے کہا کہ جو بھاشا آپ بول رہے ہیں وہی ہندی ہے اور لگ بھگ ایسی ہی بھاشا ہم لوگ بھی بولتے ہیں۔ میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے سیدھی سادی ہندستانی میں اپنا ایڈریس تیار کیا۔ فارسی اور عربی کے کوئی دو درجن لفظ نکال کر ان کی جگہ عام فہم اُردو ہندی کے لفظ رکھ دیے اُردو رسم الخط میں اس کو لکھا اور ہندی اسٹینوگرافر کو لکھوادیا۔ اس نے اس کو دیوناگری رسم الخط میں ٹائپ کیا اور یونیورسٹی نے اس کو چھاپ کر تقسیم کردیا۔ رائے پور میں میں نے اردو اسکرپٹ میں اپنا ایڈریس پڑھا اور حاضرین نے اپنی نظریں

دیوناگری اسکرپٹ پر جمائے رکھیں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ اس خطبے کو قبول عام کی سند ملے۔ چنانچہ دو ہزار آدمیوں نے کان دھر کے سُنا اور پسند کیا۔ خطبے کے بعد بڑی تعداد میں پروفیسر اور ودیارتھی مجھ سے ملنے آئے۔ میرا دل بڑھایا اور کہا کہ ایسی بھاشا کو کیوں بڑھاوا نہیں مل رہا ہے جو اپنے آپ اُبھر رہی ہے اور جس کو ہر ایک سمجھ سکتا ہے۔ اور سرکار کی طرف سے ایسی بھاشا کا پرچار کیوں ہوتا ہے۔ جس کو صرف زبان کے سوداگر ہی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ میرے دل میں ان سوالوں سے کافی ڈھارس بندھی۔ روی شنکر وشوودیالہ کے سماجیات کے پروفیسر نے جو ہندی پر پوری طرح قابو رکھتے ہیں مجھے کچھ پتے کی باتیں بتائیں۔ پہلے تو انھوں نے یہ کہا کہ جیسی بھاشا ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے سماچار یا سرکاری تقریروں میں بولی جارہی ہے یا سرکاری فائلوں میں لکھی جارہی ہے وہ Communication یا لین دین کی بھاشا نہیں ہے پھر انھوں نے بتایا کہ اس بھاشا سے لوگوں کے جذباتی ضروریات پوری نہیں ہورہی تھیں، ماں اپنے بچّے کو کس زبان میں لوری دے؟ باپ اپنے بیٹے کو کس بھاشا میں نصیحت کرے؟ عاشق اپنی محبوبہ سے کس زبان میں بات کرے؟ روزمرّہ کے بازاری اور گھریلو کاروبار میں کس زبان سے کام لیا جائے؟ چونکہ سرکاری زبان سے ان معاملات میں بالکل کام نہیں نبٹا اس لیے ضرورت تھی کہ دوبارہ ایسی زبان میں بولنے کو ملے جس سے یہ نازک کام نکل سکیں۔ چنانچہ اُردو موقع واردات پر موجود تھی۔ اس لیے بہت سے الفاظ محاورے، اصطلاحات اور طرزِ بیان ہندی نے دوبارہ اُردو سے لینا شروع کردیا ہے۔

پروفیسر مذکور نے پھر مجھ سے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ اُردو غزل دوبارہ عود کر آئی ہے اور ہندی والوں نے بھی اُردو کی بحریں، صنائع و بدائع اور الفاظ محاورے وغیرہ استعمال کرنے شروع کردیے ہیں۔ سو بات کی ایک بات انھوں نے یہ بتائی کہ اس سرکاری بھاشا کو ہندستانی عورتیں نہیں اپنا رہی ہیں۔ حتٰی کہ اتری بھارت میں ہندو عورتیں بھی اس کو نہیں بول رہی ہیں۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ جب گھروں میں مائیں اور بہنیں کسی زبان کو نہیں بولتیں تو بچّے بھی اس زبان کو نہیں اپناتے۔ پانچ چھ سال کی عمر تک جو انسان کی عمر کا سب سے زیادہ اثر پذیر حصہ ہے۔ اگر کوئی بھاشا ذہنوں میں نہ بیٹھ جائے اور بعد کے زمانے میں اس کو لاگو کرنے

کی کوشش کی جائے تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ مانا کہ چھ سال کی عمر کے بعد اسکولوں اور کالجوں میں اس بھاشا کو بولا اور رائج کیا جا سکتا ہے پر وہ بات نہیں آ سکتی جو ماں کی گود میں پلنے اور گھروں اور کنبوں میں بڑھتے وقت زبان کے سننے اور بولنے سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلی کوچوں میں بازاروں میں اور دفتروں میں بڑی حد تک لوگ وہی بول رہے ہیں جو گھروں میں مائیں بولتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے پرچار میں سرکاری مشکل پسندوں کی طرف سے جو انوسٹمنٹ ہو رہا ہے اس کا منافع یعنی ریٹ آف ریٹرن بہت کم ہے۔

اُردو غزل کا دوبارہ اُبھار جو ہندستان میں تیس سال کے بعد اب پھر شروع ہوا ہے وہ ایک طرف تو اردو اور ہندی کی قربت پر دلالت کرتا ہے تو دوسری طرف ایک اہم جذباتی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چونکہ پیڑی در پیڑی کا فصل تیس چالیس سال میں پیدا ہو چکا ہے، اس لیے جب غزل دوبارہ منظرِ عام پر آتی ہے تو اپنی ثقہ شکل میں نہیں بلکہ سیدھی سادی Elementary شکل میں آتی ہے۔ بیگم اختر، اقبال بانو، مہدی حسن، فریدہ خانم اور عابدہ پروین کی گائی ہوئی غزلیں معیاری غزلیں ہوتی تھیں۔ لیکن ہندستان میں فی الحال اردو غزل کچھ تو معیاری اور کچھ غیر معیاری معمولی گیت نما ہے۔ گانے والے کبھی کبھی بحر و قافیہ کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ یقین ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ثقہ پن دوبارہ واپس آئے گا۔ غزل اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر حاوی ہونے لگے گی اور دونوں کو پاس لانے میں مددگار ہوگی۔

غزل چونکہ حُسن و عشق، وفا و جفا اور رنگ و بو اور ذوق و جمال سے عبارت ہے اور دراصل Lyric ہے اس لیے اس کو گانا بھی انھی راگوں کی سرپرستی میں چاہیے یعنی تغزل والے یا سنگھار رس کے راگ ہیں۔ مثلاً یمن جے جیونتی باگیشوری راگیشوری بہار تلک کاموددیس کھاج وغیرہ لیکن بہت سے موسیقار اس کو گمبھیر Austere راگوں میں گا کر اس کے اثر کو کم کر دیتے ہیں۔ مثلاً پوریا مارواتوڑی مالکوس بھیرو وغیرہ۔

ٹکنیکل اصطلاحات کو چھوڑ کر اُردو اور ہندی کی نزدیکی اور میل ملاپ Convergence کے اس چوتھے دور میں اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اُردو اور ہندی فلم میں کوئی فرق رہ نہیں گیا ہے اس کے علاوہ آکاشوانی اور دور درشن کے وہ ڈرامے جو بڑی تعداد میں

لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگے ہیں۔ ان کو چاہے ہندی ڈرامے کہہ لیجیے یا اُردو ڈرامے۔ اگر پہلے سے کسی فلم یا ڈرامے کے بارے میں پہلے سے بتانہ دیا جائے کہ یہ ہندی ہے یا اُردو تو سننے اور دیکھنے والے اپنی مرضی سے کبھی ہندی کہہ لیں گے اور کبھی اُردو۔ اُردو اور ہندی خبروں کے بعد جن کو ایک خاص زبان میں پڑھنے کے لیے لوگوں کو تنخواہ یا فیس دی جاتی ہے۔ جب ہم خاندان، نکڑ، رجنی، کرم چند، بنیاد ڈرامے یا پروگرام دیکھتے ہیں تو دونوں زبانوں کی بنیادی یکسانی پر اچنبھا ہونے لگتا ہے۔

اس حقیقت کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگر کسی دوست ساتھی یا دور ہی کے جاننے والے سے آپ کی مڈبھیڑ دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی، بھوپال، سری نگر یا چنڈی گڑھ میں ہوجائے اور کھڑے کھڑے آپ ان سے ۱۵ منٹ باتیں کریں اس طرح کہ ان باتوں میں مکمل ترسیل یعنی Communication ہوتی رہے اور پھر کوئی آپ دونوں سے پوچھے کہ آپ کون سی زبان بول رہے تھے تو یہ بالکل ممکن ہے کہ آپ کہیں ہندی اور آپ کے دوست کہیں کہ وہ اُردو بول رہے تھے۔ اُردو اور ہندی کے اس نئے تال میل کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے:

ایک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

خوشنویس: ایس، ایم، مظہر